جوش ملیح آبادی: غزل مخالف غزل گو

فرزانہ ریاض، لیکچرار شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

In the end of nineteenth century and beginning of twentieth century, poetry seemed to overpower ghazal goi. In this context where ghazal has been ignored and rejected, a prominent name is Josh Malih Abadi. He objected on ghazal thoughtfully and technically. But the expression of his creative personality was very clear in both ghazal and poem. Inspite of all the efforts, he could not break the bond between ghazal goi and himself. It reflects the same contradiction based on thoughtfulness and creativity.

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

(غالب)

نقادوں نے غزل پر بہت سے اعتراضات کیے ہیں۔ مثال کے طور پر غزل کا معشوق مذکر ہوتا ہے اور یہ ایک شرمناک اَمر ہے۔ غزل آج تک انہیں مضامین و مطالب کی حامل چلی آ رہی ہے جو صدیوں پہلے ظاہر کیے جا چکے ہیں اس میں خیالاتِ نو کی مطلق گنجائش نہیں۔ غزل کا محبوب اپنی پیش کش کے اعتبار سے اس دُنیا کا نہیں بلکہ دوسری دنیا کی مخلوق معلوم ہوتا ہے۔ غزل بوالہوسی اور پست خیالی سکھاتی ہے۔ غزل کا ہر شعر جداگانہ اور متضاد مضمون کا حامل ہوتا ہے۔ تمام اصناف سخن میں تو مطالب و معانی کے لیے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں مگر غزل میں اس کے برخلاف الفاظ کے لیے مطالب و معانی کی جستجو کی جاتی ہے غزل کا وجود فارسی اور اُردو کے سوا اور کسی زبان میں نہیں پایا جاتا۔ یہ کھلا ہوا ثبوت ہے اس اَمر کا کہ غزل ایک بے کار چیز ہے۔ غزل میں ایک ایک عاشق کے ہزار رقیب ہوتے ہیں۔ غزل کے مضامین میں توافق و یک رنگی نہیں ہوتی یعنی ایک شعر میں جس شے کو سراہ کر عزیز بنایا جاتا ہے اسی کو دوسرے شعر میں مذمت کر کے گرا دیا جاتا ہے۔ غزل گو، غزل میں خاص اپنے اصلی جذبات ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوتا بلکہ اس کو یا تو یہ جذبات اپنے اوپر جبراً طاری کرنے پڑتے ہیں یا پھر اس پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات کو حوالۂ قلم کرے۔

غزل پر اعتراض کرنے والے ناقدین میں ایک نام جوشؔ ملیح آبادی کا ہے۔ جوشؔ غزل کے زبردست مخالف تھے۔ جوشؔ نے غزل کے خلاف ایک نظم بھی لکھی:

ان غزل گویوں کا ہے معشوق ایسا ناز نیں
نام جس کا دفترِ مردم شماری میں نہیں
یہ فقط رسمی مقلّد وامق و فرہاد کے
مر رہے ہیں آج تک معشوق پر اجداد کے
آج تک غالب ہے ان پہ وہ رقیبِ رُو سیاہ
کر چکا ہے زندگی جو میرؔ و مومنؔ کی تباہ
ان کے دل میں شعر کی روشن ہو کس صورت سے آگ
قافیے کے ہاتھ میں رہتی ہے جن لوگوں کی باگ

جوش ملیح آبادی بحیثیت نظم گو شاعر کے اردو کی ادبی روایت میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے نظم نگاری کے ساتھ ساتھ نثر بھی لکھی اور ادبی صحافت کو بھی اپنا قیمتی وقت دیا۔ ناقدین کے خیال میں اردو کے عظیم شاعروں کی فہرست میں صرف چار نام آتے ہیں۔ میرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ۔ اس کے بعد دوسری فہرست بڑے شاعروں کی ہے۔ اس فہرست میں سب سے پہلا نام جوشؔ ملیح آبادی کا ہے۔ اس بات کو ہم دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی میں علامہ اقبال کے بعد دوسرے بڑے شاعر جوشؔ ہیں۔

جوشؔ کے مختلف موضوعات پر کئی مضامین ماہنامہ ”کلیم“ دہلی اور دوسرے رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ انہیں میں وہ مضامین بھی ہیں جن میں انہوں نے غزل کی مخالفت کی تھی۔ یہ مضامین تعداد میں صرف تین ہیں۔ پہلا مضمون ماہنامہ ”کلیم“ دہلی جنوری ۱۹۳۶ء میں ”غزل گوئی“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون کا آغاز کرتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا:

> ”میں آج ایک ایسا مسئلہ چھیڑ رہا ہوں، جس کی مخالفت تو ہو گی ہر طرف سے اور موافقت میں بمشکل دو چار سے زیادہ آوازیں بلند نہ ہو سکیں گی......یعنی غزل کے خلاف مضمون لکھ رہا ہوں۔“[۱]

جوشؔ نظم کے مشہور شاعر تھے۔ چھوٹے سے چھوٹے مضمون یا خیال کو پھیلا کر تسلسل کے ساتھ بیان کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کے یہاں غزل بھی ”مسلسل غزل“ کی شکل میں نظر آتی ہے۔ غزل کا ایسا شعر کہنا جو کوزے میں دریا کو بند کرنے کا کرشمہ دکھاتا ہے غالباً ان کے بس میں نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے غزل کی مخالفت پر کمر کس لی۔ ان کا یہ عمل بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ ہم نظم والے ہیں اس لیے غزل کے مخالف ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ”جوش کو عام طور پر غزل کا مخالف اور دشمن کہا جاتا ہے۔ میں نے خود بھی شاید کسی جگہ اس کا اظہار کیا ہے یہ بات پوری طرح درست نہیں معلوم ہوتی۔ اول اس لیے کہ ان کی ساری شاعری خواہ جدید رومانی و انقلابی نظموں کے روپ میں ہو یا رباعیات و مثنویات کی شکل میں غزل کے مزاجِ خاص سے ہر طرح ہم آہنگ ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے ان کی شاعری کا بیشتر حِصّہ یقیناً غزل کی ظاہری شکل سے الگ تھلگ ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے اس میں وہی تغزل وہی نرمی اور وہی مٹھاس ہے۔ جس سے اردو غزل عبارت ہے اس خاص تناظر میں دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جوش دراصل غزل کے مزاج

> کے نہیں، غزل کی خادم یا ہیئت کے مخالف تھے ان کا کہنا صرف اس قدر تھا کہ ایک طویل مضمون وضاحت طلب موضوع کو غزل کے ایک شعر میں نہیں سمویا جا سکتا یہ فریضہ صرف نظم ہی انجام دے سکتی ہے اور ان کا یہ کہنا کچھ بے جا نہ تھا۔‘‘[۲]

غزل کے شعرا سے متعلق جوش ملیح آبادی کا کہنا ہے کہ تجربات و مشاہدات غزل کے شعرا کے جذبات میں ہیجان کی وہ کیفیت پیدا نہیں کر پاتے جس سے شعر کی تخلیق ہوتی ہے۔ وہ تو قوافی کو ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں اور انتہائی کدو کاوش کے بعد غزل پوری کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بقول جوش:

> ’’ان کے پیش نظر چند روایات اور چند الفاظ کا ایک مجموعہ ہوتا ہے جسے موزوں کر دینے کی خاطر وہ بعد کو اثر پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔‘‘[۳]

یہاں ’’چند روایت‘‘ سے ان کی مراد بحر و اوزان، الفاظ کے مجموعے سے قوافی اور اثر پیدا کرنے کی سعی سے شاعر کی کدو کاوش اور شعر کی تراش خراش ہے۔ یعنی غزل کا شاعر شعر کہنے کے لیے پہلے قافیے اکٹھا کرتا اور ہر قافیے پر گرہ لگانا شروع کرتا اور کچھ اشعار لکھنے کے بعد نہایت کدو کاوش کے ساتھ ان کی تراش و خراش کر کے غزل تیار کر لیتا ہے اس لیے جوشؔ ایسی شاعری کو الہامی یا حقیقی شاعری نہیں کہتے۔

جوشؔ کے مطابق شعرائے غزل محض قافیے کی تلاش اور گوناگوں واردات و کیفیات کو کھپانے کے لیے مہینوں غزل کو پورا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس لیے وہ مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ متغزلین کو چاہیے کہ وہ اپنی غزل کو معلق رکھیں اور کبھی اس کا مقطع نہ لکھیں:

> ’’نصف نصف مہینے کے بے شمار و گوناگوں واردات و کیفیات اور سب ایک واحد غزل کی تنگنائے میں سر کھپائے پڑے ہوئے ہوں! محض اس وجہ سے کہ ایک ہی ردیف و قافیہ کے ’’مزے اور موڑے‘‘ سے باندھ دیے گئے ہیں۔ مناسب ہو کہ ہمارے شعرائے متغزلین اپنی غزل کو معلق ہی رکھا کریں اور کبھی اس کا مقطع نہ لکھا کریں...... پھر یقیناً اس کا ایک ایک مصرعہ ہزار داستان در آغوش ہوگا۔‘‘[۴]

قافیہ پیمائی کی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے جوشؔ کہتے ہیں کہ غزل گو شعرا جذبہ کے ذریعے سے الفاظ کا سیدھا اور فطری راستہ اختیار نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے ذریعے سے جذبے کا غیر فطری اور غلط راستہ اختیار کرتے ہیں۔ غزل میں صرف ردیف و قافیہ کے لیے مطالب و مضامین لائے جاتے ہیں نہ کہ مطالب و مضامین کے لیے ردیف و قافیہ۔ جوشؔ کے خیال میں:

> ’’الغرض ساری سخنوری ردیف و قافیہ ہی کی ہے اور اپنی تمام تعدیلوں اور تحریفوں میں انہی کے رحم پر۔ شاعران کا محض بے جان آلۂ کار ہے۔ خود یہ الفاظ کلمات اس کے اسلحہ خانہ نہیں۔ پھر شعر گفتن چہ سود، و خیال نجتن چہ حاصل۔ مطلب یہ ہے کہ شاعر کو جانا کہیں بھی ہو، چلنا پڑے گا اسے شعر کے قوافی و خواتم کی پیشگی طے شدہ راہوں پر......‘‘[۵]

جوشؔ ملیح آبادی نظمیہ شاعری کی خصوصیات کو غزل میں تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ بطور صنف نظم کی بہت سی ہیئتیں ہوتی ہیں اور سبھی ہیئتوں کے لیے مخصوص موضوعات ہوتے ہیں اسی طرح غزل کا معاملہ بھی ہے۔ غزل موضوعات کے اعتبار سے

بنیادی طور پر حسن و عشق اور اس کے متعلقات سے تعلق رکھتی ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ غزل میں صرف حسن و عشق اور اس کے متعلقات کی ہی عکاسی کی جاتی ہے بلکہ ان موضوعات کے ساتھ ساتھ کرۂ ارض کی تمام چیزیں اور تمام موضوعات غزل کے شاعر کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ اس کی زندگی میں بھی مست گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں۔ پپیہا بھی کوکتا ہے، چاندنی بھی کھیت کرتی ہے۔ برستی اور جھومتی راتیں بھی بال بکھراتی ہیں پیچ وخم کھاتے ہوئے دریا بھی اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہیں اور افق کا دروازہ کھول کر دوشیزۂ سحر بھی اس کے روبرو آ کر مسکراتی ہے۔ ان کے علاوہ اس کی معاشرت و سیاست میں بھی انقلاب ہوتا ہے۔ وہ بھی قوم کی دل ہلا دینے والی مصیبت سے متاثر ہوتا ہے، اس کا بھی دوست بچھڑا، اس پر بھی بہت سے لوگوں نے احسان کیا ہے۔ اس نے بھی یتیم کا اترا ہوا منہ اور بیوہ کے الجھے ہوئے بال دیکھے ہیں۔ مذکورہ تمام حادثات و واقعات سے اس کا دن بھی متاثر ہوا ہے۔ جس کا اظہار اس نے اپنی غزلوں میں نظم کی طرح وضاحت وصراحت کے ساتھ نہ کر کے ایمائی انداز میں کیا ہے۔ جس کا اندازہ غزل کے ابتدائی دور سے اب تک کے تمام شعرا کی غزلوں کے موضوعات سے کیا جا سکتا ہے۔ جوشؔ ان تمام باتوں کو دیکھ نہیں پاتے یا دیکھنا نہیں چاہتے اور اپنے مؤقف پر قائم رہتے ہوئے غزل گو شاعر کے حقیقی اور عملی عشق پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”میں نے تو جہاں تک ان شعرا کا کلام پڑھا ہے، روایتی اور موروثی عشق کی بکواس کے علاوہ حقیقی اور عملی عشق کا تو مجھے کم سے کم ایک بار بھی پتہ نہیں چلا...... ان شعرا کے تمام ردیف وار کلیات و دواوین دیکھ جائیے۔ ہر جگہ آپ کو معشوق بے وفا، قاتل، خونی، غبار پسند، رقیب نواز اور عاشق کش ہی ملے گا۔“[۶]

جوشؔ طنز کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو کے غزل کے شاعر اتنے مکروہ ہوتے ہیں کہ ان پر کسی کا بھی دل نہیں آتا اگر یہ حضرات واقعی شاعر ہوتے تو رقیب روسیاہ پر غالب آجاتے اور ان کے کلام میں تقلیدی رویے کے بجائے عشق و محبت کی انفرادیت دکھائی دیتی۔

غزل پر اعتراضات حالی نے بھی کیے تھے مگر انھوں نے جوشؔ کی طرح حسن و عشق کے موضوعات کو غزلیہ شاعری سے خارج نہیں کیا بلکہ حسن و عشق کی سحرکاریوں کا اثبات کرتے ہوئے غزل کے شعرا کے تقلیدی رویے اور شعر میں پیدا ہونے والی رکاکت و ابتذال کی نشاندہی کی اور اس کی اصلاح کے مشورے پیش کیے اس کے برعکس جوش تمام غزل گو شعرا کو عشق پیشہ اور ان کی داستان عشق کو یکساں نیز تمام عاشقوں اور تمام معشوقوں کو ایک ہی مزاج و ماحول اور ایک ہی خاندان کے افراد مانتے ہیں۔ وہ غزل کے موضوعات و اسالیب کے تنوع سے صرفِ نظر کرتے ہوئے تمام شعرا کی غزلیہ شاعری کو ایک ہی داستان کی کاربن کاپی تصوّر کرتے ہیں۔ جوشؔ کے اس خیال پر اثر جلیلی نے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے اختر انصاری کے الفاظ میں کہا ہے:

> ”جذبۂ عشق کی ترجمانی میرؔ بھی کرتا ہے اور ہندی کی شاعرہ میرا بھی اور ایران کا جدید شاعر بہار بھی۔ شاعر اطالوی دانتے بھی اور قدیم یونانی شاعرہ سفو بھی لیکن ان میں سے ہر ایک کی شاعری دوسروں کی شاعری سے بنیادی طور پر مختلف ہے اس لیے کہ ہر ایک کا جذبۂ عشق ایک مخصوص جداگانہ سیاسی و معاشی ماحول میں رنگا ہوا ہے۔“[۷]

جوش کے خیال میں غزلوں کے اسّی فیصد اشعار عاشقانہ ہیں۔ بقیہ بیس فیصد میں ہی قدرے مختلف جذبات و خیالات کی عکاسی ہوئی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ شاعر جو کچھ لکھے سو فیصد اس کے عملی کردار کا مظہر ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس دوسری بات یہ بھی ذہن میں رکھنی چاہیے جوشؔ کی شبنمی شاعری میں غزل کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کے تغزل کے بنیادی عناصر شبابیات اور خمریات سے مرکب ہیں:

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے

پروفیسر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

> ’’غزل کے بارے میں جوشؔ کا یہ دعویٰ صحیح نہیں۔ محض تعلّی ہے۔ وہ خود کو نہ تو غزل کی ہمہ گیر روایات سے بچا سکے اور نہ غزل میں کسی اسلوب کے بانی ہیں۔‘‘ (۸)

جوشؔ کو اُردو کا سب سے بڑا رومانی شاعر کہا جاتا ہے۔ اسی حوالے سے ان کو شاعرِ شباب کے خطاب سے نوازا گیا۔ جوشؔ کی رومانی شاعری کے اجزائے ترکیبی تین ہیں۔

> ’’۱۔عورت ۲۔شراب ۳۔فطرت
>
> جوشؔ کی بیشتر اور بہتر نظموں کا موضوع حسن و عشق اور شراب و شاہد ہے۔ اسی موضوع پر شاعر نے بڑی کثرت و شدّت کے ساتھ، طرح طرح سے اور بار بار اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کی بے شمار تفصیلات و جزئیات نت نئے، تازہ بہ تازہ، رنگ بہ رنگ انداز میں پیش کی ہیں۔ اُردو شاعری کی عشقیہ اور خمریہ روایات میں واقعہ یہ ہے کہ جو عناصر مومنؔ، جرأتؔ، داغؔ، امیرؔ، حسرتؔ، ریاضؔ اور جگرؔ کی غزلوں میں سکڑے اور سمٹے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ جوش کی نظموں میں بہت پھیل کر پیچ در پیچ ہو گئے ہیں۔‘‘[۹]

اے شوق مجھے گمراہ نہ کر کہ شورش کے اسباب نہیں
امید کے اجڑے گلشن میں اک پھول بھی اب شاداب نہیں

☆

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

☆

اے کلی ناز سے کِھل بادۂ سرجوش اُبل
کہ نگارِ چمن و شاہد مستاں آیا

☆

اے حسن اگر عشق خریدار نہ ہوت
یہ غلغلۂ گرمیِ بازار نہ ہوتا

☆

پنہاں تھیں جس میں روح کی گہری خموشیاں
اس جنبشِ نظر کو غزل خواں بنا دیا

☆

اللہ رے حسنِ دوست کی آئینہ داریاں
اہلِ نظر کو نقش بہ دیوار کر دیا
مجھ کو وہ بخشتے تھے دو عالم کی نعمتیں
میرے غرورِ عشق نے انکار کر دیا

☆

یہ وفا کا رنگِ شکستہ ہے مری حسرتوں کا یہ خون ہے
یہ گلاب کی سی جو سرخیاں ہیں ترے تبسّمِ ناز میں

☆

نہ جانے رات کو تھا کون زینتِ پہلو
مچل رہی تھی ہوا میں شراب کی خوشبو
اُدھر محیط فلک پر فسونِ نجم و قمر
اِدھر حریمِ تمنّا میں نرگسِ جادو

جمیل الدین عالی جوش کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ غزل کا عام موضوع عشق رہا ہے۔ عشق نہ صرف اُردو غزل کا بلکہ دُنیا کی بڑی شاعری کا موضوع رہا ہے۔ اُردو غزل میں چونکہ عشق کی مختلف کیفیتوں اور اس کے متعلقات کا اظہار ہوتا ہے اس لیے غزل میں بہت سے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے مطابق یہی سبب ہے کہ غزل آج تک زندہ اور مقبول ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’اُردو غزل کی عشقیہ شاعری میں عشق کی واردات نے بدلتے ہوئے سماجی حالات کے ساتھ ساتھ ’’انفرادی عملی‘‘ تجربوں کی آنچ میں تپتے ہوئے کیا کیا رنگ بدلے یہ جاننے کے لیے......صرف میر، غالب، حالی، اقبال، حسرت، اصغر، یگانہ فراق اور فانی کے دیوان پڑھنے پڑتے ہیں۔ جن کے سستے نسخے اس وقت بھی ملتے ہیں جب ’’کلیم‘‘ نیا نیا جلوہ گر ہوا تھا......فیض اور جذبی بھی نظم کہنے کے باجود خاصے غزل گو ہی مانے جاتے ہیں اور آگے تو اب پاکستان میں حفیظ ہوشیار پوری، ناصر کاظمی، سیف اور حقی بھی اسی غزل کے نام لیوا ہیں۔‘‘[۱۰]

تابش دہلوی نے جوشؔ کے اس بیان یعنی ’’غزلوں کے اسّی فیصدی اشعار عاشقانہ ہیں‘‘ سے اتفاق تو کیا ہے لیکن انہوں ے یہ بھی کہا ہے:

> ’’عشق یا خواہش ہی وہ ’’جذبۂ اوّل‘‘ ہے جو انسان کے تمام افکار و اعمال میں جاری و ساری ہے۔ عشق کوئی فیشن نہیں جو روز بدل دیا جائے۔ ہجر و وصال تمام عشاق کا یکساں ہے۔ صرف کیفیات کے ردو بدل میں فرق ہے اور کیفیات کے ردو بدل کا فرق غزل کے مختلف شعرا کے یہاں مختلف ہے جو ہر دور کی غزل میں بدرجہ اولیٰ ملتا ہے۔ عشق بھوک کی طرح ایک بنیادی جذبہ ہے جس میں ازل سے آج تک کوئی فرق نہیں ہوا۔ اس لیے آدم وحوا کا فراق لیلیٰ و مجنوں کے فراق سے مختلف نہیں۔‘‘[۱۱]

مقبول نقش اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ’’جوش صاحب کو شروع سے لے کر آج تک تمام غزل گو شعرا کے یہاں صرف قنوطیت، زنان بازاری کے عشق اور عشق مجازی کی شراب میں تصوف کی آمیزش کے سوا کچھ نہیں ملا۔ آج کل چند سیاسی اور مناظری غزلیں نظر بھی آ رہی ہیں تو وہ انہیں سرے سے غزل ماننے کو تیار نہیں، محض ہٹ دھرمی ہے۔‘‘[۱۲]

جوش غزل کو ہندوستان کے ماضی کے قصہ پارینہ کا ایک ورق قرار دیتے ہیں۔ وہ پوری غزلیہ شاعر کو نہیں بلکہ مشاعرے کی متعارف غزل سرائی کے تابوت کو اتنا گہرا دفن کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے حشر پر جسدِ مہر ثابت ہو جائے:

> ’’قصیدے کی روح پروری ہو یا مرثیے کا ایصالِ ثواب کوئی تدبیر بھی اب ’’پیر زالِ غزل‘‘ کو شعر کی غزالۂ رعنا نہیں بنا سکتی شاید عالم گیر اعظم کے ہم زبان ہو کر ہمیں کہنا چاہیے کہ (درباری موسیقی کی طرح) مشاعروں کی متعارف غزل سرائی کے تابوت کو بھی اتنا گہرا دفن کر دینا چاہیے کہ اس کے ’’حشر جسد‘‘ پر مہر جائے۔‘‘[۱۳]

یوں تو جوشؔ کا شمار غزل مخالف شعرا میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ غزل اور حسنِ غزل کے پرستار بھی نظر آتے ہیں۔ جوشؔ کی غزل میں بادۂ شبانہ کی سرمستیاں ہیں، لذت خوابِ سحر نہیں، بلکہ رنگینی شام اور طلوع جام کا نشہ ملتا ہے۔ ان کی غزل گوئی بھی واقع نگاری کی مثال پیش کرتی ہے۔ ایسی واقع نگاری جس میں سرمستی اور والہانہ پن کی کیفیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’جوشؔ کی غزلیں سرمستی و کیفیت کا بیان ہیں۔ محبت کے واقعات کی تفصیل حسن کی کرشمہ سازیوں کی داستانیں نہایت خوبی سے اشعار میں جگہ پاتی ہیں۔ چونکہ وہ خود راہِ محبت میں گم ہو چکے ہیں اس لیے جو کچھ بیان کرتے ہیں دل کی چوٹ ہوتی ہے، دماغ کی کاوش نہیں۔‘‘[۱۴]

جوشؔ میں غزل گوئی کا بڑا سلیقہ تھا اور انہوں نے ابتدا میں بعض بہت خوبصورت غزلیں کہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جوشؔ فرطِ جذبات میں غزل کو ایک صنف سخن کے طور پر زندہ رکھنے میں ادبی نقصان اور سیاسی خطرہ مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے:

> ’’کون اس پر یقین لا سکے گا کہ ہر شاعر موزوں طبع ہوتا ہے لیکن ہر موزوں طبع شاعر نہیں ہوتا۔ کیا میری قوم ایک لمحے کے لیے غور کرے گی کہ غزل کو باقی رکھنے میں کتنا ادبی نقصان اور کس قدر سیاسی خطرہ ہے۔‘‘[۱۵]

جوشؔ کو کلاسیکی شعرا کے دواوین کے مطالعے سے شرمندگی اور مایوسی ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ غزل کو خوردہ اندیشی اور خوردہ فروشی سے تعبیر کرتے ہوئے اوچھی پونجی تک کہہ دیتے ہیں اور دنیا کی بڑی شاعری کے روبرو رکھنے کے لائق نہیں سمجھتے۔ یہاں جوشؔ کی ایک غزل کا حوالہ قابل ذکر ہے کیونکہ اس غزل کی زمین میں اکثر اساتذہ کی غزلیں ہیں، جن کی شاعری کو وہ قابل اعتنا سمجھتے ہیں۔

اب اے خدا عنایت بے جا سے فائدہ
مایوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم
ہاں آسمان اپنی بلندی سے ہوشیار
اب سر اُٹھا رہے ہیں کسیؔ آستاں سے ہم

ان اشعار میں غزل کا وہ کلاسیکی حسن بھی ہے۔ جو حسرتؔ، جگرؔ، اصغرؔ اور فانیؔ وغیرہ کے یہاں ملتا ہے اور وہ لب ولہجہ بھی جو جوشؔ ملیح آبادی کی شاعری کے لیے مخصوص ہے غزل کا یہ نرم عمومی رنگ وآب جوش کی غزلوں میں ان کے عہد کی مروجہ غزل کے زیرِ آثر آیا ہے۔

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

☆

راس اوّل تو نہ آئے گی زمانے کی فضا
راس اگر دو دن زمانے کی فضا آئی تو کیا

☆

نہ جانے سینۂ احساس پر یہ ہاتھ کس کا ہے
طبیعت بے نیازِ شادی وغم ہوتی جاتی ہے

☆

ہر چیز کائنات کی بریزِ یاس ہے
دل کیا اداس ہے کہ زمانہ اداس ہے

☆

ثبوت یہ ہے محبت کی سادہ لوحی کا
جب اس نے وعدہ کیا، ہم نے اعتبار کیا

☆

وہ غریب دل کو سبق ملے کہ خوشی کے نام سے ڈر گیا
کچھ ہنس کے تم نے بھی بات کی تو ہمارا چہرا اُتر گیا

وہ شکارِ جلوۂ دہر تھے، میں ہلاک پرِ توِ یار تھا
وہ سنور سنور کے بگڑ گئے ، میں بگڑ بگڑ کے سنور گیا

جوش اس اندازِ غزل گوئی کے عکاس ہیں جس کا سکہ مینائی و داغ دہلوی کی جمائی ہوئی محفل کے تحت لکھنؤ اور دہلی دونوں میں چل رہا تھا۔ یہ اشعار غزل کی مروجہ روش سے الگ، خاص جوشؔ کے لہجے اور آہنگ میں ہیں۔ ایسے آہنگ میں جسے بعد کو یگانؔہ نے اپنی غزل میں اپنایا تھا۔ اور وہ انہی کا ہو کر رہ گیا۔ بعد میں اس لہجے کی بازگشت شاد عرفی، سلیم احمد، اور سرشار صدیقی کے ہاں سنائی دیتی ہے۔

نظم میں کسی مضمون کو پھیلا کر مسلسل بیان کیا جاتا ہے اس لیے نظم گو شاعروں کا ذہن اختصاریت کا حامل نہیں۔ غزل کے تمام اشعار معنی کے اعتبار سے اپنی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ غزل کا شاعر بڑے سے بڑے مضمون کو بھی دو مصرعوں میں اختصار کے ساتھ پرو دینے کا ہنر رکھتا ہے۔ جوشؔ بہت بڑے شاعر تھے اور انہیں نظمیہ شاعری میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ وہ غزل کے ایک شعر میں اپنی بات اختصار کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غزل کی صنف کے خلاف ہو گئے اور اسے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا لیکن ایسا بھی نہیں کہ انہوں نے غزل سے خود کو دستبردار کر لیا۔ انہوں نے بہت سی مسلسل غزلیں بھی لکھیں۔ ان کی تعریف کرتے ہوئے اختر انصاری نے لکھا ہے: ''یہ مسلسل غزلیں جوشؔ کے بہار آفریں تخیل کی پیداوار ہونے کی حیثیت سے شاندار شعری کارنامے ہیں۔''[۱۶]

اس رائے کی روشنی میں جب ہم جوش کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سے مقامات پر ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں معنوی تسلسل پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ معنوی تسلسل نظم کا نہیں، مسلسل غزل کا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

یہ عجیب رنگ تھا مے کشو، کہ ہر ایک چہرے پہ نور تھا
یہ گماں ہے مجھ کو گذشتہ شب کوئی مست تم میں ضرور تھا
میں تڑپ کے حسن کو پا گیا وہ چمک کے خاک میں مل گیا
میں شہیدِ جلوۂ بے خودی، وہ ہلاکِ رنگِ شعور تھا
مرے سامنے تھا وہ جلوہ گر، اسے پا سکی نہ مری نظر
یہ ضیاے کثرتِ جلوہ تھی، یہ ہجومِ شانِ ظہور تھا
یہ صبا نے خاک اڑائی کیوں یہ چٹک کے غنچے نے کیا کہا
مجھے وہم ہوتا ہے ہم نوا، کوئی بھید اس میں ضرور تھا

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ جوشؔ ملیح آبادی صنفِ غزل کی مخالفت کرتے رہے مگر ان کی ذہنی و ذوقی تربیت اسی تہذیب کے زیرِ اثر ہوئی جو غزل کی تہذیب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نظم کے ساتھ ساتھ غزل بھی لکھتے رہے اور ان کی غزل کلاسیکی غزل کے عصرِ جدید کی نمائندہ ہے۔

حواشی:

۱۔ عادل حیات، ڈاکٹر۔ غزل کی تنقید۔ دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص: ۴۲۷

۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔ جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص: ۳۴

۳۔ عادل حیات، ڈاکٹر۔ غزل کی تنقید۔ ص: ۴۳۰

۴۔ ایضاً۔ ص: ۴۳۱

۵۔ ایضاً۔ ص: ۴۳۲

۶۔ ایضاً۔ ص: ۴۳۹

۷۔ ایضاً۔ ص: ۴۴۱

۸۔ خلیق انجم، ڈاکٹر۔ مرتب؛ جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ۔ نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۲ء، ص: ۲۷

۹۔ ایضاً۔ ص: ۱۲۵

۱۰۔ عادل حیات، ڈاکٹر۔ غزل کی تنقید۔ ص: ۴۴۱

۱۱۔ ایضاً۔ ص: ۴۴۲

۱۲۔ ایضاً۔ ص: ۴۴۳

۱۳۔ ایضاً۔ ص: ۴۴۴

۱۴۔ فضل امام، ڈاکٹر۔ شاعرِ آخرالزّماں جوش ملیح آبادی۔ دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۲ء، ص: ۶۷

۱۵۔ عادل حیات، ڈاکٹر۔ غزل کی تنقید۔ ص: ۴۴۳

۱۶۔ اختر انصاری۔ غزل کی سرگزشت۔ علی گڑھ: ادارہ شعر و ادب، ۱۹۷۵ء، ص: ۴۱

☆☆☆